شعلۂ آب

ستری
راشٹر زنا
ہم سے
سیدر

M. GULAB SINGH & SONS
LAHORE.
N.W. RLY. BOOK STALLS

میرے نغموں نے اپنی زیبائیش دُور پھینک دی ہے۔ انہیں آرائیش کا غرور نہیں رہا۔
زیور ہمارا ملاپ نہیں ہونے دیتے۔ وہ تیرے اور میرے درمیان حائل ہیں۔ اُن کی جھنکاریں میری آواز پوشیدہ کر دیتی ہیں
میری پُر غرور شاعری تیرے مقابل جھوٹے غرور سے شرمندہ ہو کر زائل ہو جاتی ہے اسے استاد الشعراء میں تیرے قدموں میں آ بیٹھا ہوں مجھے اپنی زندگی کو سیدھا اور سادھا سا بنانے دے تاکہ میں تیری بانسری کیطرح تیرے ہی لئے اسے موسیقی سے معمور کر دوں

شعلۂ آب

لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام رکھا گیا "سوبھاشنی" یعنی شیریں زبان والی۔ مگر قدرت ایک اُلجھی گتھی ہے جسے آج تک کوئی بھی سُلجھا نہیں سکا۔ اس بات کا کسے پتہ تھا کہ لڑکی بڑی ہو کر گونگی ہوگی۔ اس کی دو بڑی بہنیں تھیں ایک سکیشنی دوسری سوہاشنی۔ اور اسی مقابلہ سے اُس کا نام رکھا گیا تھا۔ سوبھاشنی۔ یہ ایک عام قاعدہ ہو گیا ہے جب لمبا نام ہو۔ تو کہنے والے مختصر ہی کہتے ہیں۔ اختصار کے طور پر سوبھاشنی بھی سوبھا کے نام سے مشہور ہو گئی۔

پہلی دو لڑکیوں کی شادی خواہش کے مطابق ہو چکی تھی۔ مگر اب یہ چھوٹی لڑکی والدین پر ایک خاموش، مگر وزنی بوجھ کی طرح محسوس ہو رہی تھی

عام خیال تھا۔ کہ جیسے یہ قوت گویائی سے محروم ہے۔ ویسے ہی اس کا خانہ عقل بھی خالی ہوگا۔ اور وہ اپنی شادی کی ضرورت کو بالکل محسوس نہیں کر سکتی لیکن ایسا نہ تھا۔ سوبھا بلا کی ذہین تھی۔ اور یہ خاص طور پہ دیکھا گیا ہے۔ کہ قدرت نے جسے ایک نعمت سے محروم کیا ہو۔ اس کی دماغی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

سوبھا بچپن سے ہی خود کو والدین پر ایک بوجھ خیال کرتی تھی۔ مگر اُسے اس کی تلافی کے لئے کوئی بھی ذریعہ نظر نہ آتا تھا۔ ہاں اُس کی یہ کوشش ہر وقت تھی۔ کہ عوام سے دُور رہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات وہ دُنیا کو بھُول جانا چاہتی۔ مگر ایسے کرنا اس کے لئے ناممکن سا ہو گیا تھا۔

اس کے والدین اس تکلیف کو بھُول جانے کی کوشش کرتے۔ مگر نہیں۔ دلی درد کو کوئی نظر انداز کر سکتا ہے؟ اس کی وجہ سے وہ شب و روز نہایت متفکر رہتے۔ خاص طور پہ اُس کی ماں تو اُسے بڑی ہی بے چین اور مایوس نظروں سے دیکھتی۔ مگر ایک آہ سرد کھینچ کر رہ جاتی۔ قدرت کے آگے کسی کا زور

نہیں۔"

ماں کو لڑکے کی بہ نسبت لڑکی سے زیادہ اُنس ہوتا ہے۔ اور وہ اچھی طرح سمجھتی ہے۔ کہ میں نے اسے ایک قابل عورت بنانا ہے۔ اگر اُس میں کسی قسم کی کمی ہو۔ تو وہ اُسے اپنی توہین تصور کرتی ہے اور خود بخود ذلت و شرم محسوس کرتی ہے۔ سوبھا کا باپ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ مگر ماں اُسے خود پر ایک دھبہ خیال کرتی تھی۔ دل ہی دل میں ایشور کو، خود کو، قسمت کو اور کبھی کبھی سوبھا کو بھی گالیاں دینے لگتی تھی۔

سوبھا کو قدرت نے زبان تو عطا نہ کی تھی۔ مگر وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تو موجود تھیں۔ جب کبھی کوئی خیال اس کے دماغ میں پیدا ہوتا۔ اس کے ہونٹ کانپ اُٹھتے۔ آنکھیں اظہارِ خیال پر آمادہ ہو جاتیں؟

جب ہمیں کبھی اپنا خیال ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ تو ابتدائی الفاظ کی بندش کے لئے کافی دماغ سوزی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ الفاظ کو تجزیہ کرنا بالکل آسان کام نہیں۔

اپنے خیال کی ترجمانی کے لئے یہ ممکن ہے۔ کہ ہم کبھی غلطی کر دیں۔ مگر قدرت نے آنکھیں ایک ایسی شے بنائی ہیں۔ جن کو ترجمانی کے لئے کسی قسم کے الفاظ کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہمارا اپنا ہی دماغ اُن پر ایک قسم کا سایہ ڈال دیتا ہے۔ اور آنکھیں خود بخود اظہارِ مدعا کر دیتی ہیں۔ پھر کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رہتی۔ اصل تخیل پتلیوں سے اس طرح چمک اُٹھتا ہے۔ جس طرح سیاہ بادلوں میں بجلی یا طلوع ہوتا ہوا آفتاب۔ ہم اپنی خوشی کو، غمی کو، شرارت کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ مگر آنکھیں انہیں ظاہر کئے بغیر نہیں رہتیں۔ جن کو قدرت نے قوتِ گویائی عطا نہیں کی۔ وہ اپنی آنکھوں سے ہی زبان کا کام لیتے ہیں۔ جن کا اظہار گہرے سمندر کی طرح اتھاہ ہے۔ مگر نمایاں آسمان کی طرح یعنی گونگے ایک بے بہا دولت سے تو محروم ہوتے ہیں۔ مگر ایک عجیب اور پُر اسرار سکوت کے مالک سوبھا چاند پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی۔ جو لب دریا واقع تھا۔ جیسے گاؤں چھوٹا سا تھا۔ ویسے ہی دریا بھی چھوٹا تھا

اس میں کبھی طغیانی نہیں آئی۔ اور نہ ہی کبھی کسی دوسری قسم کی تکلیف ہی گاؤں والوں کو ہوئی۔ سب اُسے اپنا محسن خیال کرتے تھے۔ اور وہ بھی گاؤں کے کے ہر فرد کے خاندان کا وفادار رکن معلوم ہوتا تھا۔

دریا کے دونوں کناروں پر ہرے بھرے درختوں کا سایہ تھا۔ گویا قدرت کا تمام حسن سمٹ کر یہاں آگیا ہو۔ آب رواں بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے شغل کے انجام میں مشغول تھا۔

گوپال کرشن کا مکان آبادی سے کچھ نکلا ہوا دریا کی طرف تھا۔ کشتی میں آنے والے یا آر پار جانے والے اشخاص تمام آبادی کا نظارہ اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ اور خاص طور پر گوپال کرشن کا مکان تو اُن کی نظروں میں رہتا۔

سوبھا اپنے اس مختصر سے مکان سے نکل کر ہر روز دریا کے کنارے سبز گھاس پر آ بیٹھتی۔ شاید اُسے قدرت کی اس خاموش زبان سے خاص محبت ہو گئی تھی۔ یا اور کچھ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اس دنیوی دولت

کے حلقہ میں اس بے زبان لڑکی کا کسی کو خیال بھی یا نہیں؟ اس کے لئے تو قدرت خاموش تھی دُنیا والے خاموش تھے۔

وہ اپنا کام ختم کر کے چُپ چاپ دریا کے کنارے آ بیٹھتی۔ اور قدرت کے خاموش عناصر سے ہم کلام رہتی۔

یہاں دریا کی روانی کا مدگھنا شور۔ گاؤں والوں کی آوازیں۔ پرندوں کی گلکاریاں، پتوں کی سرسراہٹ ہر تمام آوازیں ایک دوسری سے ٹکرا کر اس کے لئے باعثِ اضطراب ہو جاتیں۔ تمام آوازیں ایک جا ہو کر ایک لہر کی صورت میں اس کے آئینہ دل کو چھوٹ لگاتیں۔

قدرت کی نیرنگیاں گویا اُس کی گویائی تھیں۔ سیاہ اور منور آنکھیں۔ اس کی زبان جو بے مطلب آوازیں اس کے کانوں تک پہنچتی۔ اس کے نزدیک دُنیا والوں کی بھی زبان تھی۔ اس مکان پر سو بھا کے لئے درختوں کے تنوں سے لے کر خاموش ستاروں تک خون کے آنسو رونے اور ٹھنڈی آہیں بھرنے کا سامان تھا۔"

دوپہر کے وقت جب ماہی گیر کھانا کھانے چلے جاتے۔ گاؤں والے کوئی سرد جگہ تلاش کر کے بغرض آرام لیٹتے۔ چڑیاں درختوں پر خاموش ہو جاتیں گھاٹ پر سکوت کی حکومت ہوتی۔ یعنی ہر چیز تنہائی محسوس کرتی۔ اس وقت نیلگوں آسمان کے نیچے قدرت اپنی گونگی زبان سے موجود ہوتی اور یا یہ بے زبان لڑکی۔

سوبھا کے گھر دو گائیں تھیں۔ سرب باشی اور پنگولی ان دونوں نے صرف سوبھا کے منہ سے کبھی اپنا نام نہیں سُنا۔ پھر بھی وہ اس کے پاؤں کی آواز سے ہی اندازہ لگا لیتیں۔ کہ سوبھا آرہی ہے۔ گو وہ بھی سوبھا کی طرح بے زبان تھیں۔ مگر اس کی بے معنی اور خاموش گفتگو کو خوب سمجھتی تھیں۔ سوبھا اُن کے قریب آتی اور سرب باشی کی گردن میں اپنے بازو حائل کر دیتی۔ اپنے رُخساروں کو اس کے رُخساروں سے ملتی۔ اسی دوران میں پنگولی اسے اپنی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی۔ اور اُس کے چہرے کو اپنی زبان سے چاٹتی۔ سوبھا ہر روز تین بار

ضرور اور زیادہ سے زیادہ جتنی بار ہو سکتا۔ ان کے پاس آتی۔ اور جب کبھی کوئی اُسے سخت سُست کہتا۔ تو اُسی دم اپنی گونگی سہیلیوں کے پاس چلی آتی۔ تاکہ غم غلط ہو سکے۔ انہیں اوقات میں ہنگولی اور سرب باشی اس کے دلی درد کو خود پر محسوس کرتیں۔ اُس کے نزدیک تر ہو کر اپنے سینگ اس کے نرم بازوؤں سے نزدیک تر ہو کر اپنے سینگ اس کے نرم بازوؤں سے رگڑتیں۔ اپنی بے چینی اور خاموش زبان سے اس کا غم غلط کرنے کی سعی کرتیں۔ ان دو سہیلیوں کے علاوہ اس کے گھر چند بکریاں اور ایک بلی کا بچہ بھی تھا۔ لیکن سوبھا کو اُن سے کچھ زیادہ اُنس تھا۔ مگر وہ اُسے بہت محبت سے دیکھتے تھے۔ جب کبھی بلی کا بچہ موقعہ پاتا۔ اس کی گود میں آ جاتا۔ اور سوبھا اس کے بالوں میں اپنی اُنگلیوں سے کنگھی کرتی۔ تو وہ بیٹھی نیند سو جاتا۔

اشرف المخلوقات میں بھی اُس کا ایک ساتھی تھا۔ مگر اس بات کا اندازہ لگانا کہ اس کے تعلقات اس سے کیسے تھے۔ ذرا مشکل ہے۔

نہ بول سکتا تھا۔ اُس کا نام تھا "کدن" وہ گوسائیں کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ اور آوارہ تھا۔ اس کے اس فعل سے والدین سخت نالاں تھے۔ یہ بات عام مشہور ہے۔ کہ بیکار انسان اپنوں کو ناخوش کر کے دوسروں سے خراج تحسین لیا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے پاس تو کوئی کام ہوتا ہے۔ بالکل یہی حالت تھی کدن کی۔ جیسے کسی گنجان آبادی کو کسی وسیع میدان کی ضرورت محسوس ہوتی۔ تا کہ عوام کچھ آرام کا سانس لے سکیں۔ ہوا خوری کر سکیں۔ ایسے ہی ایک گاؤں کے کچھ تا کہ بوقت فرصت بیکار آدمیوں کا وقت غپ شپ میں اچھا گزر سکے جب بھی کسی کو ان کی ضرورت ہو۔ فوراً موجود ہوں۔

کدن کو مچھلیاں پکڑنے کا بہت شوق تھا۔ اس شوق نے یہاں تک زور پکڑا۔ کہ اس کا بہت سا وقت دریا پہ کٹنے لگا۔ وہ حسب معمول دوپہر کو دریا پہ مچھلیاں پکڑنے جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی اور سوبھا کی ملاقات ہو گئی۔ خواہ

وہ بے کار تھا یا کچھ کام کرتا تھا۔ مگر اُسے دوست کی پہچان تھی اور دوستی کی قدر تھی جب وہ ساحل پر مچھلیاں پکڑتا۔ تو اس کا ایک خاموش دوست بہترین ساتھی ہوتا۔ کدن سوبھا کی خاموشی کی وجہ سے اُسے خاص توقیر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اسی اُنس کی وجہ سے وہ اس کا پورا نام لینے کی بجائے صرف سوبھی کہہ کر پکارتا تھا۔

سوبھا آملہ کے پیڑ کے نیچے آرام سے سر ہتھیلی پر رکھے بیٹھی رہتی۔ اور کدن چند قدم کے فاصلہ پر اپنی ڈور کو دریا میں ڈالے رہتا۔ وہ ہر روز اپنے ساتھ چند خالی پان لے آتا جنہیں سوبھا آرام سے بیٹھی بیٹھی بناتی اور گاہے گاہے اُسے دیتی۔

کافی دیر تک بیٹھنے اور مچھلی کا شکار دیکھتے رہنے کے دوران میں شوبھا کی خواہش ہوتی کہ وہ اپنے تئیں کدن پر ایک بڑی مددگار ثابت کرے۔ اور کسی طرح سمجھا دے۔ کہ وہ اس عالم پر بے کار بوجھ نہیں ہے۔ مگر اس کے

پاس اس اظہار کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں ایک غیر معمولی طاقت حاصل کرنے کے لئے بھگوان سے پرارتھنا کرتی۔ تاکہ وہ اپنی کرامات سے کدن کو متحیّر کر سکے۔ اور اس کی زبان سے یہ الفاظ سُن سکے۔

"میرے خواب میں بھی نہ تھا۔ کہ میری سُو ایسا کر سکے گی۔"

خیال تو کیجئے۔ اگر سوبھا کوئی پری ہوتی۔ تو وہ دریا سے آہستگی کے ساتھ اُٹھتی۔ اور بجائے ایک حقیر چیز مچھلی کے کدن کے لئے ایک سانپ کا مَن کنارے پر لا ڈالتی۔ اور کدن اُسی وقت اپنا شکار چھوڑ کر دریا میں چھلانگ لگاتا۔ پھر کسی اور ہی دُنیا میں جا پہنچتا۔ اور دیکھتا کہ گونگی لڑکی سُو، چاندی کے محل میں زریں بستر پہ آرام فرما ہے۔ اس وقت سوبھا جواہرات سے منوّر ہونے والے شہر کے بادشاہ کی بیٹی معلوم ہوتی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ ناممکن تھا بالکل ناممکن۔ دراصل ناممکن تو کوئی بات نہیں۔ مگر مشکل تو یہ بات تھی۔ کہ وہ پاتالپور کے شاہی خاندان میں

پیدا ہی نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک براہمن کے ہاں پیدا ہوئی تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ گوسائیں کے لڑکے کو حیران کرنے کا کوئی ذریعہ نہ پاتی۔

دنوں کے بعد مہینے اور مہینوں کے بعد سال گزرتے گئے۔ وہ جوان ہو گئی۔ اور خود کو سمجھنے لگی۔ اس دوران میں ایک ناقابلِ اظہار تخیل سمندر کے وسطی مقامات سے اُٹھنے والی موجوں کی طرح جب کہ چاند مکمل ہوتا ہے۔ اس کے دماغ سے پیدا ہوا۔ اور وہ اپنے آپ کو اُوپر سے نیچے تک دیکھتی۔ پھر سوال کرتی مگر جواب نہ ملتا جس سے اُسے کچھ تسلی ہوتی۔

شب منور تھی۔ چاند اپنے پُورے جوبن میں آسمان پر جلوہ فگن تھا۔ ستارے جھلملا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایسی خوبصورت رات پہلے نہیں دیکھی۔ سوبھا نے اپنے مکان کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ اور ڈرتے ڈرتے باہر جھانک کر دیکھا۔ اس وقت قدرت بھی سوبھا کی طرح تنہا، خوابیدہ زمین کو دیکھ رہی تھی۔ سوبھا کی منضبط اور جوان زندگی یہ عالم دیکھ کر بیتاب ہو

گئی۔ اور رنج و راحت سے اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ یوں تو وہ تنہا ہی تھی۔ مگر اس عالم تنہائی نے اس کے خیال کو اور بھی سخت بنا دیا۔ اس کا دل وزنی ہو گیا۔ اس کی زبان نہ چلتی تھی۔ اس لئے ایک لفظ بھی نہ نکال سکی۔ گویا خاموش دھرتی ماتا کے ایک کنارے ایک خاموش حیران اور پریشان لڑکی کھڑی تھی۔

والدین سب کچھ سمجھتے ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں جو ان سے پوشیدہ ہو۔ سوبھا کی شادی کے خیال نے اس کے والدین کو بڑی فکر میں ڈال دیا تھا کیونکہ لوگ اکثر انہیں برا بھلا کہنے اور اپنی برادری سے خارج کر دینے کی دھمکی بھی دیتے۔ عام خیال تھا۔ کہ لڑکی آوارہ ہو رہی ہے۔ اس کے گھر خوشحالی تھی۔ روزانہ دونوں وقت چاول اور مچھلی پکتی۔ اس لئے حاسد بھی کم نہ تھے۔ عورتوں کے کہنے سننے سے اس کا باپ کچھ دن کے لئے گاؤں سے چلا گیا۔ اور تھوڑے ہی دن بعد واپس آکر کہنے لگا۔ ہمیں کلکتہ چلنا چاہئیے۔ سب اس اجنبی مقام پر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ دیکھ کر

سوبھا کا دل بیٹھ گیا۔ آنکھیں گھر آلود صبح کی طرح نم ہو گئیں۔ اور ایک نامعلوم خوف کی وجہ سے جو اس کے دل میں جم چکا تھا۔ ایک بے زبان جانور کی طرح وہ اپنے والدین کے پیچھے پڑ گئی اپنی لمبی اور بڑی بڑی آنکھوں سے اُن کا مُنہ تکتی اور ان کے دلی خیال معلوم کرنا چاہتی۔ مگر سب خاموش تھے۔ بالکل.... خاموش،

ان تمام باتوں کے دوران میں ایک سہ پہر کو کدن شکار کرتے کرتے سوبھا کے پاس آ بیٹھا اور ہنس کر کہنے لگا۔

سو تمہارے باپ نے تمہارے لئے اچھا شوہر چُنا ہے۔ اب تمہاری شادی بہت جلد ہونے والی ہے کیسی خوشی کی بات ہے۔ کیا تم مجھے بالکل بھول جاؤ گی؟ ایسا نہ کرنا۔ یہ کہہ کر وہ پھر ہنسا۔ اور اپنے کام میں لگ گیا۔ کدن کے لئے شاید یہ الفاظ بالکل معمولی تھے۔ مگر بیچاری سوبھا کے لئے ایسا نہ تھا۔ وہ خوف زدہ ہرنی کی طرح اپنے شکاری کا مُنہ تکنے لگی۔ اور اپنی خاموش زبان سے دریافت کرنے لگی۔

میں نے تمہارا کیا بگاڑا۔ معاف کرو"۔ وہ اشکبار آنکھوں سے کندن کی طرف دیکھتی رہی۔ مگر زیادہ دیر تک نہ بیٹھ سکی اور چلی گئی۔

اس کا باپ اپنی خوابگاہ میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ جب سوبھا نے اُسے دیکھا۔ اور روتے ہوئے اپنے آپ کو اُس کے پاؤں پر ڈال دیا۔ باپ کی آنکھیں بھی پُرنم ہو گئیں۔ اُس نے اُسے چھاتی سے لگا لیا۔ اور بہت پیار کیا۔ مگر سوبھا کی آنکھوں سے ایک چشمہ اُبل پڑا تھا۔ آخر یہ فیصلہ طے ہوا۔ کہ وہ آئندہ صبح کو کلکتہ روانہ ہو جائیں۔ سوبھا نے گاؤں کے قریب آ کر اپنی سہیلیوں کو الوداع و خیرباد کہی۔ اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔ گلے سے لگایا۔ ان کا چہرہ غور سے دیکھا۔ پھر اُداس ہو گئی۔ اس کی وہ آنکھیں جو زبان کا کام دیتی تھیں۔ اشکبار ہو گئیں اور پھر جیسے کسی برساتی نالے کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔ جس شب کا یہ واقعہ ہے۔ وہ رات چاندنی تھی۔ سوبھا گھر سے نکل کر اسی دل پسند گھاس کے سبز بستر پر لب دریا آ لیٹی۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ زمین پر

اس طرح چھپا دئے گیا۔ وہ اپنی پُرسکوت ماں سے کہہ رہی ہے۔" مجھے اپنے سے جُدا نہ کرنا۔ مجھے اپنی آغوشِ محبت میں لے لو۔ اور چھاتی سے لگا لو مگر کسی نے اس کی ایک نہ سُنی۔ دوسرے دن سب روانہ ہو گئے۔

ایک دن کلکتہ کے کسی مکان میں سوبھا کی ماں نے اُسے اچھے اچھے کپڑے پہنائے۔ سر گوندا زیوروں سے آراستہ کیا۔ یہ سب سامان دیکھ کر سوبھا کی آنکھیں اسی سابقہ روانی سے بہنے لگیں۔ اس اچھے وقت میں اور ساتھ ہی اس ڈر سے کہ اس کی آنکھیں خراب نہ ہو جائیں اس کی ماں نے اُسے بُرا بھلا کہا۔ مگر آنسوؤں کی تیزی زیادہ ہو گئی۔ اسی وقت دولہا اپنے ایک دوست کے ساتھ اپنی بیوی کو دیکھنے کے لئے اندر آیا۔ اس وقت والدین کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ مبادا لڑکا لڑکی کو پسند نہ کرے۔ پھر ہم کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔

اس امتحان کے داخلہ سے پیشتر سوبھا کی ماں لڑکی کو خاموش رہنے کی تلقین کر چکی تھی۔ مگر اس

پر کوئی اثر نہ تھا۔

معائنہ کرنے والوں نے اُسے دیر تک اُوپر سے نیچے تک دیکھا اور کہا "اچھی ہے۔"

اس کے رونے پر خاص توجہ کی گئی۔ اور خیال کیا۔ کہ یہ اس کے نرم دل ہونے کی اول دلیل ہے اور اپنے دل میں اس موضوع پر بحث کی۔ کہ وہ دل جو آج اپنے والدین سے جُدا ہونے پر اس قدر ملول ہے کل یقیناً اچھا ثابت ہوگا۔ آنسوؤں نے جو دراصل شعلہ غم سے پگھل پگھل کر خون نکل رہا تھا۔ سوبھا کی قدر و منزلت بڑھا دی۔ اور دُولھا نے سوبھا میں کوئی نقص نہ پایا۔ آخرکار ایک مبارک دن شادی کے لئے تجویز ہُوا۔ اور اپنی گونگی لڑکی کا ہاتھ ایک دوسرے کے حوالے کر کے سوبھا کے والدین اپنے وطن کو واپس آ گئے۔ انہوں نے شکر کیا۔ کہ وہ دین و دُنیا کی بُرائی سے بچ گئے۔ بھگوان نے لاج رکھ لیا۔

سوبھا کے شوہر کا روزگار کسی دوسرے شہر میں تھا۔ شادی کے دن بعد وہ اُسے بھی اپنے ساتھ وہاں لے گیا۔ صرف ایک ہفتہ کے عرصہ

میں بھی سب کو معلوم ہو گیا۔ کہ دلھن بے زبان ہے اگر اس سے پیشتر ان کو معلوم نہ ہو سکا۔ تو اس میں اس بیچاری گونگی کا کیا قصور۔ اس نے تو کسی کو بھی دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ ہی کبھی زندگی میں اس نے اس راز کو کسی سے چھپانے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھیں اظہار مدعا کر رہی تھیں۔ مگر کسی نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی۔ اس نے ہر ایک کو بار بار دیکھا۔ التجا کی۔ مگر سمجھنے والے نہ سمجھ سکے۔ کہ ایک غریب گونگی کیا کہہ رہی ہے؟ افسوس! بچپن سے جو اس کی خاموش زبان سمجھنے تھے۔ وہ تو بچھڑ گئے۔ اب وہ اپنا غم غلط کرے تو کس طرح؟ اب شب و روز اس کے خاموش دل سے بے آواز۔ مگر کبھی نہ رکنے والی آواز آیا کرتی جس کو تمام دماغ سمجھنے سے قاصر تھے۔ صرف سب کے دلوں کا حال جاننے والا ہی سمجھ سکتا تھا ۔

سوزِ غم میں دیدۂ تر کام آ سکتا نہیں!
یہ وہ آتش ہے جسے پانی بجھا سکتا نہیں

شعلۂ دل

صرف اتنی خواہش ہے۔ کہ کچھ دیر کے لئے
مجھے اپنے پاس بیٹھنے دے۔ جو کام مجھے
کرنے ہیں۔ انہیں پھر کر لوں گا۔

تجھ سے الگ ہو کر میرا قلب راحت و
آرام سے بالکل بے بہرہ ہو جاتا ہے۔ میرا کام
محنت کے تھاہ ساگر میں بہت تکلیف دہ
ہو جاتا ہے۔

آج میرے دریچہ میں سرد آہیں بھرتے ہوئے
موسم بہار کا دیوتا داخل ہو رہا ہے اور شہد
کی مکھیاں شگفتہ پھولوں پر ایک عجیب راگ
الاپ رہی ہیں۔

اب تیرے مقابل خاموش بیٹھ جاؤں اور
زندگی کا آخری گیت گاؤں؟

شعلۂ دل

میں اور میرا ایک دلی دوست ایک دن ریل میں بیٹھے ہوئے کلکتہ جا رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک آدمی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مسلمانی لباس میں تھا۔ اس کی باتیں سنکر حیرانی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ دنیا کی ہر بات کے سلسلے میں وہ اس طرح باتیں کرتا۔ جیسے ایشور پہلے اسی سے مشورہ کرکے سب کام کرتا ہے۔ دنیا میں جتنی بھی اچھی یا بری سازشیں ہوتی ہیں۔ جیسے روسیوں کا ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ انگریزوں کی پوشیدہ چالیں۔ ان سب کے معاملہ میں کچھ بھی نہ جاننے کے سبب سے ہم لوگ اس کی باتوں پر یقین کرنے لگے۔ ہمارے نئے دوست نے مسکرا کر کہا۔"

"دنیا میں جتنی باتیں ہوتی ہیں۔ ان کا ذکر تو آپ کے اخبار والے کر ہی نہیں سکتے۔"

گھر سے دور جانے کا پہلا موقعہ تھا۔ ہم تو اس کی باتیں سنکر سناٹے میں آ گئے۔ وہ آدمی بہت ہی عالم تھا۔ کبھی لیکچر دینے لگتا۔ تو کبھی فارسی کے شعر بولتا لیکچر اور فارسی کے شعروں میں اپنا دخل نہ ہونے کے سبب ہم اس کی ہر بات کے زیر اثر ہونے لگے۔ یہاں تک کہ میرے دوست کے دل میں یقین ہو گیا کہ یہ ہمارے نئے دوست ضرور کسی خاص سوسائیٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اس آدمی کی ہر معمولی بات کو بھی بڑے غور سے سننے لگا تھا۔ اور کسی کسی بات کو اپنی پاکٹ بک میں لکھتا جاتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے دوست کی اس حرکت کو دیکھ کر وہ آدمی بہت ہی خوش تھے۔

گاڑی آ کر لکھنؤ جنکشن پر ٹھہری۔ ہم لوگ دوسری گاڑی کے انتظار میں ویٹنگ روم میں جا بیٹھے راستہ میں انجن کی خرابی کی وجہ سے دوسری گاڑی بہت دیر سے آئے گی۔ یہ سنکر میں ٹیبل کے اوپر بستر بچھا کر سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ کہ اس آدمی نے یوں کہنا شروع

کیا۔

نظامِ ریاست کے متعلق دو ایک باتوں میں اختلاف ہونے کے سبب سے جب میں ریاست جوناگڈھ کا کام چھوڑ کر حیدرآباد کے نظام کے ہاں نوکر ہو گیا تب مجھے نوجوان اور مضبوط آدمی دیکھ کر بھڑوچ میں اردلی کا محصول وصول کرنے کی نوکری دی گئی۔

بھڑوچ بہت اچھی بارونق جگہ ہے۔ پہاڑ کے نیچے گہرا کھڈوں میں سُسُنا ندی ٹیڑھی میڑھی بہہ رہی ہے۔ ٹھیک اس ندی کے کنارے پہاڑ کے نیچے پتھر کے پندرہ سیڑھیوں والے گھاٹ کے اوپر ایک سنگِ مرمر کا محل بنا ہوا ہے اس کے ارد گرد کوئی آدمی نہیں رہتا۔ بھڑوچ کا بازار اور گاؤں یہاں سے بہت دور واقع ہے۔ دو سو برس کے قریب ہوئے ہونگے۔ جب شاہ محمد نے اپنے عیش و عشرت کے لئے یہ محل تعمیر کرایا تھا۔ اُس وقت محل کے حمام فواروں سے گلاب کا عطر برسا کرتا تھا۔ اور اسی جگہ سنگِ مرمر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر فارس کی نوجوان بیگمیں نہانے سے پہلے سر کے لمبے لمبے بال کھول کر ستار کو گود

میں رکھ کر غزلیں گایا کرتی تھیں۔

اس وقت نہ تو اب وہ فوارے ہی چھٹتے ہیں اور نہ وہ گانے ہی ہوتے ہیں۔ سنگ مرمر کے فرش پر اب وہ نازک پاؤں کبھی نہیں پڑتے۔ مگر اس وقت وہ مجھ جیسے محصول کلکٹروں کا ٹھکانہ بنا ہوا تھا۔ میں بھی اسی محل میں رہنے لگا۔ لیکن دفتر کے بڈھے چپڑاسی فضل خاں نے مجھے کئی دفعہ منع کیا۔ کہ میں اس محل میں نہ رہوں۔ ایک دفعہ اس نے کہا۔ کہ اگر آپ نہیں مانتے۔ تو کم از کم رات کو وہاں نہ جایئے گا۔ مگر میں نے ہنس کر بات اڑا دی۔ نوکروں نے بھی صاف کہہ دیا۔ کہ وہ دن کو تو کام کر دیا کریں گے۔ مگر رات کو وہاں نہیں رہینگے وہ گھر اتنا بدنام ہو گیا تھا۔ کہ چور بھی اس گھر میں گھسنے کا حوصلہ نہ کرتے تھے۔

پہلے پہل آنے پر اس غیر آباد پتھر کے محل میں مجھے بھی کچھ کچھ ڈر سا لگنے لگا۔ جہاں تک ہوتا تھا میں تمام دن باہر ہی رہتا تھا۔ اور رات کو تھکا ماندہ آ کر بستر پر لیٹ رہتا تھا۔

لیکن ایک ہفتہ بعد ہی ایک عجیب نشہ مجھ

پر غالب آنے لگا۔ وہاں کئی عجیب اور حیران کن واقعات ہونے لگے۔

گرمیوں کے دن تھے۔ بازار میں اتنی رونق نہ تھی کام کاج بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں اسی دریا کے کنارے آرام کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ ندی سوکھ رہی تھی۔ دوسرے کنارے پر بالوں کے کئی انبار لگے ہوئے تھے۔ جو سورج کی شعاؤں سے دوپہر کے وقت رنگین معلوم پڑتے تھے۔ اس کنارے دریا کے صاف پانی میں شعاعیں جھلملا رہی تھیں۔

سورج آہستہ آہستہ پہاڑ کے پیچھے پیچھے غروب ہو گیا۔ اس وقت میری خواہش گھوڑے کی سواری کرنے کی تھی۔ مگر عین اسی وقت سیڑھیوں سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ گھوم کر دیکھا تو کوئی نہ تھا۔

شاید مجھے مغالطہ ہو گیا ہو۔ یہ سمجھ کر میں پھر بیٹھ گیا۔ مگر بیٹھتے ہی کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ جیسے بہت سے آدمی میری طرف بھاگے چلے آتے ہیں۔ خوف کے مارے میرا جسم کانپ اٹھا۔ گو میرے سامنے کوئی آدمی نہ تھا۔ تو بھی مجھے معلوم

ہونے لگا۔ کہ اس گرمی کی شام کو کئی نازک عورتیں غسل کے لئے زینے اُتر رہی ہیں۔ گو اس شام کو دریا کے کنارے کے سناٹے میں سہیں کچھ بھی نہ تھا۔ مگر پھر بھی میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ فوارے چل رہے ہیں اور اُن میں سے سینکڑوں دھاروں کی طرح مذاق کرتی ہوئی کئی حسین عورتیں میرے پاس سے نکل گئیں۔ اور مجھ سے ذرا بھی شرمائی تک نہیں میرے سینہ میں ایک اُبال سا اُٹھا دل دھڑکنے لگا۔ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ خوف کی دھڑکن تھی یا خوشی کی بڑی خواہش ہوئی کہ اچھی طرح دیکھوں مگر سامنے دیکھنے کی کوئی چیز نہ تھی۔ اچھی طرح کان لگا کر سُننے سے اُن کی سب باتیں سُن سکتا ہوں گا مگر جب کان لگا کر سُننے لگا۔ تو پازیب کی آواز کے علاوہ کچھ اور نہ سنائی دیا "

یکا یک ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ دریا کے پانی میں اُچھل مچ گئی۔ وہ ایک دوشیزہ کے بالوں کی طرح ہوا میں بکھر اُڑنے لگا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ میری آنکھوں کے سامنے کئی نوجوان خوبصورت عورتیں برہنہ دریا کے گھاٹ کی سیڑھیوں سے نیچے

اُتر رہی ہیں۔ اور پھر پانی میں کھیل رہی ہیں۔ مگر یہ سب وہم تھا۔۔۔۔ اس میں اصلیت نہ تھی۔

اس واقعہ سے میرے دل میں شک گزرا ہو سکتا ہے۔ کہ مجھے اکیلا پاکر کوئی بھوت میرے دل میں گھس گیا ہو میں غریب دھوبی کا محصول وصول کر کے اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ شاید مجھے یہ اس حالت میں نہ دیکھ سکتا ہو۔ میں نے دل میں کہا۔ آج خوب کھانا کھانا چاہیئے شاید پیٹ خالی رہنے سے ہی یہ خیالات میرے دماغ میں موجود رہتے ہوں۔ میں نے باورچی کو بلا کر کہا۔ آج کھیر۔ حلوہ۔ پلاؤ وغیرہ سب کچھ بناؤ۔

دوسرے دن بستر سے اُٹھنے پر یہ واقعات بہت ہی بے مذاق معلوم پڑے۔ خوشی خوشی اپنا ہیٹ پہن کر کام پر چلا۔ اس دن کام زیادہ تھا۔ اس لئے شام کو دیر ہو گئی۔ جب محل کے نزدیک پہنچا تو نہ معلوم کون کہہ رہا تھا۔" تم بہت ہی بیوقوف ہو۔ اتنی دیر کیوں کی؟ ہم یہاں انتظار کر رہی ہیں"

محل کی سیڑھیوں کے اوپر پہنچتے ہی سامنے کا ہال کمرہ بہت ہی بڑا تھا۔ اس میں تین بڑے بڑے اور اونچے ستون تھے۔ جن پر بہت قسم کی

مینا کاری کی ہوئی تھی۔ یہ ہال ہمیشہ سے ہی سنسان
رہتا تھا۔ آج بھی وہاں روشنی نہ تھی۔ دروازہ کھول کر
جیسے ہی کمرہ کے اندر داخل ہوا۔ ویسے ہی گھر کے اندر
گھبراہٹ مچ گئی۔ جیسے بہت سی دوشیزائیں برآمدہ
سے اِدھر اُدھر بھاگ گئیں۔ میں کہیں بھی کچھ نہ دیکھ
کر سناٹے میں کھڑا اکا کھڑا رہ گیا۔ میرے جسم کے
رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں ستون کے درمیان
کھڑا تھا۔ کہ ویسے ہی عطر کی مہک آنے لگی۔ ایسا
معلوم ہوا۔ جیسے فوارے چھوٹ رہے ہیں اور اُن کا
نکلا ہوا پانی جھر جھر کر کے سنگ مرمر کے فرش پر
گر کر ستار بجا رہا ہے۔ کبھی زیوروں کی چھنچھناہٹ
کی آواز آتی۔ اور کبھی کسی کے گانے کی آواز آتی۔
جیسے کوئل گا رہی ہو۔ میں کھڑا کھڑا پاگل سا ہو گیا
اُسی وقت میرا نوکر لیمپ جلا کر میرے پاس
پاس لے آیا۔ نہ معلوم اُس نے مجھے پاگل سمجھا
یا نہیں۔ لیکن اس وقت مجھے یقین ہو گیا۔ کہ
میں مست ہوں۔ اور یہ بھی میں نے سوچ لیا۔ کہ اس
بات کو تو ہمارے شاعر لوگ ہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ دنیا
میں کوئی خیالی فوارہ بھی چھوٹ سکتا ہے یا نہیں اور

کوئی دوشیزہ خیالی انگلیوں سے ستار بجا سکتی ہے یا نہیں لیکن یہ ٹھیک تھا۔ کہ روئی کا محصول وصول کر کے ساڑھے تین صد روپیہ ماہوار پاتا ہوں، تب پھر اپنے پہلے وہم کو یاد کر کے اپنے بستر پر بیٹھ کر اخبار پڑھتے ہوئے ہنسنے لگا۔

اخبار بینی کے بعد کھانا کھا کر لیمپ گل کر کے میں سو رہا میرے سامنے کی کھڑکی سے نظر ڈال کر اندھیرے جنگل سے گھرے ہوئے پہاڑ پر کوئی چارپائی پر بیٹھے مجھے دیکھ رہا تھا۔ انہی خیالات میں نامعلوم میں کب سو گیا۔ اور کب تک سوتا رہا۔ لیکن اچانک ہی چونک اٹھا۔ گھر میں ضرور کھٹکا ہوا تھا۔ لیکن کوئی آدمی دکھائی نہ دیا۔ اندھیرے پہاڑ پر سے دیکھنے والا غائب ہو چکا تھا۔ چاند کی روشنی میرے کمرے کی کھڑکی سے فرش پر آ رہی تھی۔"

کوئی بھی آدمی نہ دکھائی دیا۔ تب بھی مجھے معلوم ہوا۔ کہ کوئی مجھے آہستہ آہستہ دھکیل رہا ہے میرے جاگتے ہی اس نے مجھے اشارہ سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔

میں جھکے جھکے اٹھا۔ لیکن اتنے بڑے محل میں

میرے علاوہ اور کوئی بھی نہ تھا۔ تو بھی قدم قدم پر یہ خوف پیدا ہونے لگا۔ کہ میرے قدموں کی آہٹ سے کہیں کوئی جاگ نہ پڑے۔ محل کے سب کمرے بند پڑے رہتے تھے۔ اور ان کمروں میں میں کبھی گیا بھی نہ تھا۔

اُس رات سانس روکے قدم بڑھاتا ہُوا میں اس کے پیچھے کہاں جا رہا تھا۔ میں یقین سے کہہ نہیں سکتا کتنے ہی تنگ اندھیرے راستے کتنے ہی برآمدے گذر کر میں اس کے پیچھے جا رہا تھا۔"

میری عجیب رہبر مجھے آنکھوں سے دکھائی نہ دی لیکن اس کی صورت میرے دل میں تھی۔ وہ عرب کی عورت تھی۔ ڈھیلی آستین کا کُرتہ۔ ٹوپی کے کنارے سے ایک بُرقعہ سا پڑا تھا۔

آخر کار میری رہبر ایک لال رنگ کے پردے کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔ اور مجھے بھی اُدھر آنے کا اشارہ کیا۔ سامنے کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن ڈر کے مارے میرا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا۔ کہ اس پردے کے سامنے زمین پر کمخواب کی پوشاک پہنے ایک حبشی ننگی تلوار پاس رکھے دونوں ٹانگیں پھیلائے سو رہا ہے۔ رہبر نے اُس کی ٹانگیں بچا کر کے پردے کا ایک حصّہ کھینچ دیا۔

پردے کے پیچھے فارسی قالین کا فرش تھا۔ تخت کے اوپر کوئی بیٹھا تھا۔ مگر یہ نہ دیکھ سکا۔ کہ وہ کون تھا لیکن سبز رنگ کے ڈھیلے پاجامہ کے نیچے زری کا جوتا پہنے دو خوبصورت پاؤں مخملی گدے پر رکھے ہوئے دکھائی دیے۔ ایک کنارے ایک تپائی پر چاندی کے برتن میں کچھ پھل وغیرہ پڑے تھے۔ اس کے پاس ہی دوسری تپائی پر دو جام اور ایک بوتل بڑھیا شراب کی رکھی تھی۔ ایک طرح کا نشہ دینے والی بھینی بھینی خوشبو سے میں اپنے آپ کو بھول گیا۔

میں دل کی بے کلی کو دبائے جب حبشی کی ٹانگوں کو عبور کرنے لگا۔ ویسے ہی وہ چونک پڑا۔ اس کی چھاتی پر رکھی ہوئی تلوار زمین پر جھنکار کے ساتھ گر پڑی۔ اچانک ہی عجیب آواز سن کر میں بھی چونک پڑا۔ دیکھا ابھی اپنے بستر پر لیٹا ہوا ہوں۔ جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ چاند کی جگہ سورج نے لے لی تھی۔

میرے دل کے ساتھ رات کی سخت دشمنی ہو گئی۔ جاگنے کی تھکاوٹ سے جسم سست ہونے لگا اسی سست جسم سے کام کرنے جاتا تھا۔ اور اسوقت رات کو بہت ہی منحوس۔ خوفناک اور جادوگرنی سمجھتا

تھا۔ لیکن رات کو دن بھر کے ماندے جسم کو دیکھ کر دن کا بُرا کہنا تھا۔

شام کے بعد میں ایک نشے میں پھنس جاتا تھا۔ تب کوٹ پتلون مجھے اچھا نہ لگتا تھا۔ تب میں خیالات کی دُنیا میں مبتلا ہو کر سر پر نیلے رنگ کی مخملی ٹوپی، ڈھیلا پاجامہ اور مخملی پاپوش پہن کر رومال کو خوشبو عطر لگاتا اور سگریٹ کی جگہ بنارسی تمباکو پھانکتا اور ایک تخت پر جا بیٹھتا۔

اس کے بعد رات جتنی زیادہ گزرتی اُتنا ہی لطف ہوتا جسے میں ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کر سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے موسم بہار کے پھول ہوا میں اس محل کے کمروں میں اُڑتے پھرتے اور جو تھوڑی دُور تک تو دکھائی دیتے ہیں۔ مگر بعد میں نامعلوم کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ اور میں بھی ان کے ڈھونڈنے کے لئے جیسے ہر کمرے میں گھومتا تھا۔

اسی نشے میں میں حنا کی خوشبو ستار کا بجنا اور اُس دوشیزہ کو ہردم جامن رنگ کا دوپٹہ اور اُس کے نازک پاؤں میں گلابدار جوتا اور پھولدار انگیا۔ اور لال پھولدار ٹوپی دیکھ کر پاگل سا ہو گیا تھا۔

اُس نے مجھے پاگل بنا دیا۔ میں اُسی کے فراق میں تمام دُنیا میں نامعلوم کس نشہ میں مست اُس "مایاپوری" کی گلی گلی اور کمرہ کمرہ میں گھومتا پھرتا تھا۔

کبھی کبھی تو میں آئینہ کے سامنے بیٹھ کر خوب سج دھج کرتا تھا اُسی وقت اچانک دکھائی دیتا کہ آئینہ میں میرے عکس کے پاس اُسی دوشیزہ کا سایہ پڑتا تھا۔ دم بھر میں گردن ٹیڑھی کر کے اپنی بڑی موٹی آنکھوں سے اشارہ کرتی اور ایک انداز سے بھاگ جاتی تھی۔ اسوقت میرے دل میں چنگاریاں اٹھتی تھیں میں سج دھج کرنا چھوڑ کر پاس پڑی چارپائی پر لیٹ جاتا۔ میری چاروں طرف پہاڑی ہوائیں جیسے بہت محبت بہت پیار سے اٹکھیلیاں کرتے اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے تھے۔

ایکدن میرے پہر میں نے گھوڑے پہ سوار ہو کر گھومنے جانے کا ارادہ کیا۔ مگر نہ معلوم کون طاقت مجھے ایسا کرنے سے روکنے لگی لیکن اس دن میں نے ترکا کھونٹی پر میرا کوٹ اور ہیٹ لٹک رہی تھی۔ اُسے اُتار کر پہننے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہوا کا ایک جھونکا اتنے زور سے آیا کہ میرا کوٹ اور ہیٹ میرے ہاتھ سے نکل کر ہوا کی تیزی میں شامل ہو گئے۔

اس دن پھر سیر کو جانا رک گیا۔ میں نے کھانا کھایا اور سونے کا ارادہ کیا لیکن آدھی رات گذرے پھر اٹھ کر چلا۔ ... [illegible]

ہُوا۔ جیسے کوئی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے جیسے کوئی میری چارپائی کے نیچے فرش کے اندر، اس محل کی پتھر کی دیوار تلے کسی قبر میں سے کوئی رو رو کر کہہ رہا ہے۔

"تم مجھے یہاں سے نکال کر لے چلو"

میں کون ہوں میں کس طرح اور کس دوشیزہ کو اس خوابی دُنیا کی قبر سے کھینچ کر لے چلوں۔ تم اب کہاں تھی اے میری جان! تم کس جھیل کے کنارے کھجور کے درختوں کے جھنڈ کی چھایا میں کس گھر اور کس شہر میں پیدا ہوئی ہو۔ یہ تھے میرے دماغ کے خیالات۔

اُسی وقت چپڑاسی پاگل کی طرح چلّا اُٹھا۔ "الگ رہو۔ سب جھوٹ ہے.... سب" میں نے ہڑبڑا کر دیکھا تو صبح ہو چکی تھی۔

چپڑاسی نے صبح کی ڈاک لا کر مجھے دی۔ اور باورچی نے آ کر پوچھا۔ "آج کیا کھائیے گا؟"

میں نے پختہ ارادہ کر لیا۔ کہ اب اس گھر میں رہنے لگا۔ دفتر کا چپڑاسی مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ میں خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔

جیسے جیسے شام نزدیک آ رہی تھی ویسے ہی میں خیال کرنے لگا کہ ہمیں تو کہیں جانا ہے دفتر کے کام میں دل نہ لگا۔ میں قلم پھینک کر بڑا رجسٹر دھم سے بند کر کے اُسی وقت تانگہ پر سوار ہو کر وہاں سے چل دیا۔ دیکھا غائبانہ طاقت سے تانگہ خود بخود ہی اس محل کے

دروازہ پر جاؤنگا۔ میں جلدی سے سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

آج تمام کمروں میں سناٹا تھا۔ اندھیرا گھر جیسے ناراض ہو کر منہ پھیلائے ہوئے تھا۔ نفرت سے میرا دل تلملا اٹھا۔ لیکن کس کو اپنی نفرت دکھاتا۔ اور کسکے روٹھنے سے مناتا اور کس سے معافی مانگتا؟ گھر بھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں بیتاب دل سے ادھر اُدھر گھومنے لگا۔ دل گانے کو للچانے لگا۔

اچانک ہی بھری پیشانی پر اوپر سے دو بوند آنسو آ کر گرے اس پہاڑ پر خوب گھنے بادل چھائے ہوئے تھے اندھیرا جنگل اور دریا کا پانی سیاہ تختہ کیطرح معلوم دیتا تھا۔ اچانک ہی جیسے زمین و آسمان تھر تھر کانپ اٹھے!

آج میرے ملازم بھی نئے مکان میں تھے۔ محل میں لیمپ جلا ہوا کوئی نہ تھا۔ اس اندھیرے میں میں محسوس کرنے لگا۔ کہ دوشیزہ فرش پر بیٹھی اپنے بال نوچ رہی ہے اسکی پیشانی سے خون بہہ رہا ہے کبھی کبھی تو وہ پاگلوں کیطرح ہنس دیتی ہے اپنی انگیا کو پھاڑتی اور اپنی چھاتی پیٹتی ہے کھلے ہوئے دروازوں سے ہوا کے جھونکے آ رہے ہیں۔

رات بھر پانی برستا رہا۔ میں اندھیرے کمروں میں ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ کہیں بھی کوئی نہ تھا۔ اسیوقت میرا چپڑاسی چلا اٹھا۔

"الگ رہو۔ ہٹے رہو۔ سب جھوٹ ہے"

میں نے دیکھا کہ صبح ہو گئی ہے۔ اور چپڑاسی اپنے اصول کے مطابق اسی محل کے چاروں طرف گھوم کر وہی صدا لگا رہا ہے۔ اچانک ہی مجھے خیال آیا۔ کہ شاید یہ بوڑھا چپڑاسی بھی کبھی میری ہی طرح محل میں رہ چکا ہے۔ اب پاگل ہو کر بھی اس جال سے آزاد نہیں ہو سکا۔

میں اسی دم برسات میں اس کے پاس بھاگا گیا۔ اور اس سے پوچھا یہ مہر علی کیا جھوٹ ہے؟

وہ میری بات کا جواب نہ دیکر پاگلوں کی طرح ہنستا ہوا محل کے گرد اگرد بھاگنے اور چلانے لگا۔ "ہٹتے رہو سب جھوٹ ہے یہ سب جھوٹ ہے۔"

میں اسی دم دفتر میں جا کر دوسرے چپڑاسی سے بولا۔ کریم خاں تم بتاؤ۔ کہ اس کا کیا مطلب ہے؟

کریم خاں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں سارا قصہ مختصر طور پر بیان کیا۔

اس نے کہا۔ اس محل میں پہلے بہت محفلیں لگا کرتی تھیں۔ ناچ رنگ کا تو کہنا ہی کیا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا جب ستار اور دوسرے سازوں کی آواز نہ آتی ہو۔ اور اس محل میں محبت کی آگ جلا کرتی تھی۔ انہیں سب دلوں کی جلن سے۔ انہیں سب پُر محبت گانوں کے فراق میں محل کے پتھر تک بیتاب ہیں۔ نوجوان اور خوبصورت آدمی کو پا کر وہ اسے اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتے۔ جو کوئی رات تک اس محل میں رہا وہ پھر باہر نہیں نکل سکا۔ مگر مہر علی پاگل ہو کر یہاں سے باہر نکل آیا۔

میں نے پوچھا "تو کیا اب میرے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے؟"
کریم خاں نے کہا "صرف ایک راستہ ہے۔ جو بہت مشکل ہے
سُنیئے۔ لیکن وہ راستہ بنانے سے پہلے گل باغ کی ایک پرانی خادمہ
کا قصّہ کہنا بہت ضروری ہے۔ ویسا جبران کُن اور دل توڑ واقع
آج تک نہیں ہوا ہوگا۔"
اسی وقت قلیوں نے آکر کہا۔ گاڑی آرہی ہے جلدی ہی بچھونے
باندھنے گاڑی آگئی۔ اُس گاڑی کے ایک فسٹ کلاس
ڈبہ میں سے ایک انگریز سٹیشن کا نام پڑھنے کی کوشش میں
کھڑکی سے باہر سر نکالے کھڑا تھا۔ ہمارے نئے دوست کو
دیکھتے ہی وہ "ہیلو" کہہ کر خوشی سے چلّا اٹھا۔ اس انگریز نے
اس کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور ہم لوگ سیکنڈ کلاس کے ڈبہ
میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہ شخص پھر نہ ملا۔ اور نہ ہی اس پرانی نوکرانی کا
قصّہ معلوم ہوا۔"
میں نے اپنے دوست سے کہا۔ وہ شخص ہم کو بے بہرہ دیکھ
کر ہمیں بیوقوف بنا گیا ہے۔ یہ قصّہ شروع سے آخیر تک جھوٹ
ہے!
اس طعنہ زنی پر میری اور میرے دوست کی کھٹ پٹ
ہوگئی۔

اس عالم کے جشن میں مجھے بھی مدعو کیا گیا ہے
جس سے میری زندگی خوشی سے بھر گئی ہے۔
میری آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔ میرے کان سُن
چکے ہیں ؛

اس جشن میں ساز بجانے کا کام میرے
سپرد کیا گیا تھا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا۔
میں نے کیا۔

میں دریافت کرتا ہوں۔ کہ کیا وہ وقت
آ گیا کہ میں اندر داخل ہو سکوں اور تیرا
حسین چہرہ دیکھ کر اپنا خاموش پرنام تیرے
چرنوں میں پیش کر دوں ؛

شعلۂ الم

کانپور کے زمیندار بابو رام گوپال کے گھر کی دودھیا ہو کے والدین میں سے کوئی نہ تھا۔ سسرال میں بھی اپنا کہلانے والا کوئی نہ تھا۔ نہ خاوند تھا۔ اور نہ ہی کوئی بیٹا بیٹی۔ اس کے خاوند کے بڑے بھائی رام گوپال کا ایک ننھا سا بچہ تھا۔ جسے وہ بہت ہی محبت کرتی تھی۔ اس بچے کی پیدائش کے بعد اس کی والدہ بہت عرصہ تک بیمار رہی۔ اس لئے بچہ کی پرورش بھی کلیانی نے ہی کی۔ بچہ اس سے اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ اپنی حقیقی والدہ کے پاس دم بھر کو بھی نہ جاتا تھا۔ کلیانی بھی اس سے بہت خوش تھی۔

ایک دن اچانک ہی کلیانی اپنے محبت بھرے دل کو بچے کے سپرد کر کے اس جہان فانی سے کوچ کر گئی

نہ معلوم کس صدمہ سے اس کی حرکتِ قلب یک لخت بند ہو گئی۔ دُنیا کے سب کام حسبِ معمول چل رہے تھے۔ مگر اس محبت بھرے دل کی حرکت ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ بعد میں پولیس آکر تنگ نہ کرے اس ڈر سے رام گوپال نے چار براہمنوں کو اکٹھا کر کے کلیانی کی لاش کو شمشان پہنچانے کا انتظام جلدی جلدی کر دیا۔ کانپور کا شمشان بستی سے بہت دُور تھا۔ تالاب کے کنارے ایک جھونپڑی تھی۔ اور اس کے پاس ہی بڑ کا ایک گھنا درخت تھا۔ اس کے علاوہ اس جنگل میں اور کچھ نہ تھا۔ پہلے اس جگہ ایک نالہ بہتا تھا۔ پہلے اس جگہ ایک نالہ بہتا تھا۔ جس وقت کا یہ ذکر ہے۔ اس وقت وہ نالہ خشک ہو گیا تھا اسی خشک نالے کے ایک حصّہ کو ٹھیک کر کے شمشان کا تالاب بنا لیا گیا تھا۔ اس وقت لوگ اس تالاب کو بڑا پاک سمجھتے تھے۔

لاش کو جھونپڑی میں رکھ کر چاروں آدمی لکڑی کی انتظار میں بیٹھے رہے۔ لکڑی آنے میں جب بہت دیر ہو گئی۔ تو ان میں سے دو آدمی یہ دیکھنے کے لئے چلے کہ لکڑی آنے میں اتنی دیر کیوں ہو گئی ہے۔

اور دو آدمی لاش کے پاس ہی بیٹھے رہے۔

ساون کی اندھیری رات تھی۔ بادل گھرا ہوا تھا۔ آسمان میں ایک ستارہ بھی نہ تھا۔ اندھیری جھونپڑی میں دونوں آدمی خاموش بیٹھے تھے۔ ایک آدمی کی چادر میں دیا سلائی اور موم بتی بندھی ہوئی تھی۔ مگر بھیگی ہوئی دیا سلائی بہت کوشش کرنے پر بھی نہ جل سکی۔ ساتھ کی لیمپ بھی ہوا کے زور سے گل ہو گئی تھی۔ کچھ عرصہ چپ رہنے کے بعد ایک بولا "اگر اسوقت ایک چلم تمباکو ہوتا۔ تو بہت اچھا ہوتا۔ جلدی کے سبب سے کچھ بھی ساتھ نہ لیا"

دوسرا آدمی بولا "اگر تم کہو۔ تو میں دوڑ کر سب سامان چند منٹوں میں لا دوں؟"

اس کے بھاگنے کے ارادہ کو سمجھ کر دوسرے آدمی نے کہا "باپ رے! اور میں یہاں اکیلا بیٹھا رہوں گا؟"

پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ ایک ایک لمحہ گھنٹے گھنٹے کا معلوم ہونے لگا۔ جو لوگ لکڑی لینے گئے تھے۔ ان کو دل ہی دل میں گالیاں دینے لگے۔ ان کو یقین ہو گیا کہ وہ آدمی ضرور کہیں آرام سے بیٹھے تمباکو پی رہے ہیں۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ ہاں تالاب کے کنارے مینڈک لگا

کی آوازیں ضرور سنائی دیتی تھیں۔ اسی وقت ایسا معلوم پڑا۔ جیسے لاش نے جنبش کی۔ مردہ نے کروٹ بدلی۔

جو آدمی بیٹھے تھے۔ وہ ایشور کا نام لینے لگے اچانک ہی اس جھونپڑی میں ایک گہری سانس لینے کی آواز آئی دونوں آدمی ایک دم جھونپڑی سے باہر نکلے اور بھاگتے بھاگتے گاؤں کی طرف چلے۔

وہ میل کے قریب دوڑنے پر انہوں نے دیکھا۔ کہ ان کے دونوں ساتھی لیمپ ہاتھ میں لئے واپس آ رہے ہیں۔ جو آدمی لکڑیوں کے لئے گئے۔ دراصل وہ تنہا کو پینے ہی گئے تھے لکڑیوں کا انہیں کوئی فکر نہ تھا۔ پھر بھی انہوں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو کہا۔ کہ لکڑیاں کاٹی جا رہی ہیں۔ دوکاندار ابھی مزدوروں کے ذریعے بھیجے گا۔ تب یہ دونوں واپس آ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے لاش کے ہلنے اور سانس لینے کا واقعہ سنایا۔ مگر ان دونوں نے ان کا تمسخر اڑایا۔ اور انہیں لاش اکیلی چھوڑ آنے پر خوب ڈانٹا۔

اسی وقت پھر چاروں آدمی اس جھونپڑی میں پہنچے جھونپڑی کے اندر جا کر دیکھا۔ لاش غائب تھی کفن کا کپڑا ادھر ادھر پڑا تھا۔

سب لوگ حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہوئے

جھونپڑی سے باہر آئے۔ باہر بھیگی زمین پر چھوٹے چھوٹے قدموں کے نشان موجود تھے۔

رام گوپال سے اس واقعہ کا ذکر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں یہ سوچ کر آدمیوں نے صلاح کی کہ لاش جلا دی گئی ہے۔ یہ کہہ کر اپنی جان بخشوانی چاہیئے۔

صبح جب آدمی لکڑیاں لیکر آئے۔ انہیں خبر ملی۔ کہ لکڑیاں دیر تک نہ آنے سے لاش کو جھونپڑی میں پڑی۔ لکڑیوں سے جلا دیا گیا ہے۔

چونکہ لاش کوئی قیمتی چیز نہیں سمجھی جاتی۔ جسے کوئی دھوکہ دے کر چوری کر لے "

(۱۳)

عام طور پر دیکھا گیا ہے۔ کہ کئی بار انسان پر ایک خاص قسم کی بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ اور کئی کئی گھنٹے تک جسم میں زندگی کا کوئی بھی آثار نظر نہیں آتا۔ اور بعد میں خود بخود زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔

کاکیانی بھی مری نہ تھی۔ بلکہ کسی صدمہ سے بیہوش ہو گئی تھی۔ جس سے اس کی زندگی کے سب آثار غائب ہو

ہو گئے تھے۔ جب اُسے ہوش آیا۔ اور اپنے چاروں طرف اندھیرا دیکھا۔ تو گھبرا گئی۔ اُسے اندھیرے میں بھی معلوم ہو گیا۔ کہ وہ اپنے گھر میں نہیں ہے۔ ایکدفعہ اس نے اپنی جیٹھانی کو "بھین جی" کہہ کر بھی پکارا۔ لیکن اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ خوف کے مارے وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اُسے بہشتی کی پہلی یاد آنے لگی۔

اس کی جیٹھانی رسوئی گھر میں بیٹھی بچے کے لئے دودھ گرم کر رہی تھی۔ اپنی گود خالی دیکھ کر وہ برداشت نہ کر سکی تھی۔ اسی سبب سے وہ بیہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ اس نے بھری آواز میں پکارا "بھین" بچے کو لے آؤ۔ نہ معلوم میرا دل کیوں چھٹپٹا رہا ہے۔ اس کے بعد چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ایک کتاب پر سیاہی کی بوتل اُلٹ گئی ہو کہ اس وقت بچے نے اسے اپنی توتلی زبان سے چاچی کہہ کر پکارا تھی تھا یا نہیں ؟

پہلے کلمبانی کو خیال آیا۔ کہ شاید یم پوری میں ایسا ہی اندھیرا ہوتا ہے۔ وہاں کچھ بھی سننے اور دیکھنے لائق نہیں ہے نہ کوئی شغل ہوتا ہے صرف سونا اور سو کر اُٹھنا ہی کام ہے۔

لیکن جب کھلے دروازے سے ہوا کا جھونکا آیا۔ اور مینڈکوں کی آواز سنی تو اُسے برسات کا خیال آیا۔ ایک بار بجلی چمکی۔ جس سے اُس نے دیکھا کہ باہر تالاب ہے۔ اور تھوڑی دور پر بڑ کا درخت اُسے یاد آگیا۔ کہ کبھی کبھی تہواروں کے موقعوں پر وہ اس تالاب پر نہانے آیا کرتی تھی۔

پہلے تو اس نے سوچا کہ گھر چلی چلوں۔ مگر بعد میں خیال کیا۔ کہ میرا گھر لوٹنا ٹھیک نہیں۔ وہاں کے لوگوں کا خیال ہے۔ کہ میں مرگئی ہوں۔ مجھے کوئی گھر نہیں رکھے گا۔ میرے وہاں جانے سے لوگ بُرا خیال کریں گے۔ دُنیا سے تو میں اُٹھ گئی ہوں۔ اب ایک بھوت ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو بھلا لوگ مجھے کیوں رام گوپال کے عالیشان گھر سے لا کر یہاں سنسان شمشان میں پھینک جاتے رام گوپال کے گھر میں بہنوشی کا واقعہ اس کے ذہن میں آگیا۔ اور اپنے گھر کو اپنی بستی سے اتنی دور پاکر وہ سوچنے لگی کہ اب میرا اس زمین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اب اپنی روح کی چھایا ہوں۔

یہ سوچ کر وہ جھونپڑی سے نکلی اور چل دی۔ ڈر فکر اور شرم و حیا اب اس سے کوسوں دور تھے۔ چلتے چلتے اس کے پاؤں تھک گئے۔ وہ کمزوری محسوس کرنے

لگی۔ مگر کسی طرح بھی وہ سنسان جنگل ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ صبح ہوئی تو اسے گاؤں کے گھروں سے دھواں نکلتا دکھائی دیا۔ اس وقت اُسے کچھ ڈر سا معلوم ہُوا۔ اُسے یہ کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ کہ زمین کے ساتھ۔ انسانوں کے ساتھ اس کا اس وقت کیا رشتہ ہے۔ جب تک وہ سنسان جنگل میں تھی۔ رات کے اندھیرے میں تھی۔ تب تک وہ بےخوف تھی۔ مگر اب بستی کے آدمیوں سے ڈر سا آنے لگا تھا۔

زیادہ چلنے اور برسات کے ہونے کے سبب سے کلیانی کے سب کپڑے کیچڑ سے بھر گئے تھے تھکاوٹ اور رات کے جاگنے سے اس کے چہرے سے پاگل پن ٹپکتا تھا۔ شاید گاؤں کے لڑکے اُسے پاگل سمجھ کر پتھر مارتے۔ مگر خوش قسمتی سے سب سے پہلے اسے ایک راہگیر ملا۔ اس شریف راہگیر نے کلیانی سے کہا۔

"آپ کسی بھلے گھر کی معلوم پڑتی ہیں۔ اس حالت میں اکیلے کہاں جا رہی ہیں؟"

کلیانی نے پہلے تو کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس کیطرف حیرانی سے دیکھنے لگی۔ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ کہ وہ دُنیا میں ہے۔ یا وہ کسی بھلے خاندان کی ہے۔ راہگیر کی یہ سب باتیں اُسے ایک خواب سی معلوم ہونے لگیں۔ راہگیر نے

پھر بڑی ہمدردی سے کہا۔
" چلو بیٹی! میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟
کلدیا نی سوچنے لگی۔ سسرال تو جا ہی نہیں سکتی۔ اور والدین کے ہاں تو کوئی ہے ہی نہیں۔ تب اسے اپنی ایک سہیلی کا خیال آیا!
سہیلی کا ہی سے کہ وہ لڑکپن سے ہی الگ ہو چکی تھی۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی ہی رہتی تھی۔ اور کبھی کبھی تو خط و کتابت میں شکوہ شکایت کے سبب سے آپس میں روٹھ بھی جایا کرتی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو یہی بتانا چاہتی تھیں۔ کہ دونوں میں سے ایکدوسرے کو کون زیادہ محبت کرتا ہے۔ اس بات کا کسی کو خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ کہ ملاقات ہونے پر کوئی بھی کسی کو لمحہ بھر کے لیے اپنی آنکھوں سے الگ نہ کر سکے گی!
کلدیانی نے اس راہگیر سے کہا۔" کہ انبالہ میں بابو کالیچرن کے گھر جاؤں گی!
وہ راہگیر لاہور جا رہا تھا۔ اور انبالہ ان کے راستہ میں ہی تھا۔ اس لئے اُس نے اسے اپنے ساتھ انبالہ لیجانے میں کوئی غیر واجب بات نہ دیکھی۔ اور اسے بابو کالیچرن

کے ہاں پہنچا دیا۔

دونوں سہیلیاں بہت مدت بعد ملیں تھیں اس لئے چند منٹ ایک دوسرے کو پہچان گئیں۔ کامنی نے کہا "بہن! آج تو میں بہت ہی خوش ہوں۔ اور اپنے کو خوش قسمت سمجھتی ہوں۔ جو تمہارے درشن ہوئے۔ مجھے تو اب تمہارے ملنے کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ مگر تم یہاں کیسے آئی ہو؟ کیا سسرال والوں نے تمہیں نکال دیا ہے؟"

کلیانی نے بھری آواز سے جواب دیا "بہن سسرال کا ذکر مت کرو۔ مجھے یہاں ایک نوکرانی کی طرح رکھ لو میں تمہارا سب کام کروں گی"

کامنی نے اُسے محبت سے ایک ہلکا سا تھپڑ رسید کیا۔ اور کہا "کیا باتیں بکتی ہو؟ تم میری سہیلی ہو۔ تم میری۔۔۔۔۔"

اتنے ہی میں بابو کالیچرن گھر میں آ گئے۔ کلیانی حیرانی سے اس کے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر وہاں سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے نہ تو پردہ ہی کیا۔ اور نہ شرم ہی ظاہر کی۔ کامنی نے اس کے متعلق اپنے خاوند کو سمجھا یا۔

کلیانی کامنی کے گھر تو آگئی مگر اس سے بے تکلف نہ ہو سکی۔ اُسے ہر وقت اپنے متعلق ایک قسم کا شک سا لگا رہتا تھا۔ وہ کامنی کی طرف غور سے دیکھتی۔ اور نامعلوم کیا سوچتی رہتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی۔ کہ کامنی اور اس کا خاوند اس سے بہت دور رہتے ہیں کسی دوسری ہی دنیا میں اور میں ایک چھپا ہوا ہوں۔ کامنی بھی کلیانی کی یہ حالت دیکھ کر فکرمند ہوئی۔ وہ اسے نہ سمجھ سکی۔ عورتیں یہ نہیں چاہتی ہیں۔ کہ کوئی راز وہ چھپائیں۔ اور نہ دوسرا ان سے کوئی راز پوشیدہ رکھے۔ اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو ایک دوسرے سے تنگ آجاتی ہیں۔ عورت کی فطرت میں یہ بھی ایک چیز ہے؟

کلیانی اپنے کو کامنی سے دور رکھنے کی جتنی ہی کوشش کرتی۔ اتنا ہی کامنی اس سے ناراض رہنے لگی۔ اس نے سوچا۔ یہ کیا آفت میں نے اپنے سر اٹھا لی ہے۔ مگر ادھر کلیانی خود ہی اپنے سے ڈرتی تھی۔ وہ خود ہی اپنے پاس سے بھاگنا چاہتی تھی۔ مگر بھاگ نہیں سکتی۔ اسی لئے کبھی کبھی وہ اپنی کوٹھڑی میں پڑی پڑی چلا اٹھتی تھی۔ اس کے ان افعال سے گھر کے لوگ بھی اس سے ڈرنے لگے۔ نوکروں وغیرہ کو بھی گھر میں

بھوت دکھائی دینے لگے۔ ایک دن رات کے وقت کلیانی اپنی کوٹھڑی سے اُٹھ کر روتی ہوئی کامنی کے کمرے میں گھسی اور بولی :-

" بہن! میں تمہارے پاؤں چھوتی ہوں۔ اکیلے مجھ سے رہا نہیں جاتا۔"

کامنی کو جیسے ڈر لگا۔ ویسے ہی غصہ کے مارے تمتما اُٹھی۔ اُس نے خیال کیا۔ کہ اسے ابھی گھر سے باہر کرے مہربان کالیچرن نے بہت سمجھا کر اسے ٹھنڈا کیا۔ اور اپنے کمرے کے پاس کی کوٹھڑی میں کلیانی کی رہائش کا انتظام کرا دیا۔

دوسرے دن کامنی نے اپنے خاوند سے کہا " تم کیسے آدمی ہو۔ ایک عورت اپنے سسرال سے نکل کر تمہارے گھر میں آ کر رہی ہے۔ ایک ماہ سے اُوپر ہو گیا۔ مگر وہ چلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ مگر تم ہو کہ اس بات کا خیال ہی نہیں کرتے۔ تمہارے دل میں کیا ہے۔ کیا مرد ایسے ہی ہوتے ہیں؟"

کالیچرن سمجھتے تھے۔ کہ کلیانی کے سسرال والے ضرور اس پر ظلم کرتے ہوں گے۔ اور اس ظلم کو برداشت نہ کرتے ہوئے ہی یہ ہمارے گھر میں آ گئی ہے۔ اس کے

والدین بھی نہیں ہیں۔ اس حالت میں میں کس طرح اسے گھر سے نکال دوں؟ مگر کامنی کی باتوں سے بھی اس کو دلی چوٹ پہنچی۔ اپنے گھر کی خوشیوں کو وہ مٹانا نہ چاہتا تھا۔ آخر وہ کانپور کلیانی کے سسرال میں گیا۔

جب کالیچرن کانپور گئے۔ تو کامنی۔ کلیانی کے پاس آئی اور بولی۔"

"اب تمہارا یہاں رہنا نہ ہوگا۔ لوگ چہ میگوئیاں کر رہے ہیں"

کلیانی نے سنجیدگی سے کہا۔ "مگر میرا لوگوں سے کیا رشتہ ہے؟"

یہ سنکر کامنی سناٹے میں آگئی۔ اور کرخت لہجہ میں بولی۔" تمہارا رشتہ نہ ہو۔ مگر ہمارا تو ہے۔ ہم دوسرے گھر کی بہو بیٹی کو کیا کہہ کر اپنے گھر رکھ سکتے ہیں۔ تم سسرال کیوں نہیں چلی جاتی؟"

کلیانی نے کہا۔ "باپ رے۔ تم کہتی کیا ہو؟"

کلیانی نے سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔" کیا تم لوگوں کی کچھ ہوں؟ تم لوگ ہنستے ہو۔ روتے ہو۔ پیار کرتے ہو اور سب باتیں کرتے ہو۔ اور میں صرف

تمہارا مُنہ دیکھا کرتی ہوُں۔ تم انسان ہو۔ اور مَیں چھپایا ہوں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ایشور نے مجھے ایک دفعہ لیکر بھی کیوں تمہاری دُنیا میں بھیجدیا ہے؟

کملیانی کی یہ باتیں سُن کر کامنی نے اس کا مطلب کچھ اور ہی نکالا۔ وہ اس کا اشارہ نہ سمجھ سکی۔ اس نے کچھ جواب بھی نہ دیا۔ مُنہ پھُلا کر کمرہ سے چلدی

(۳)

رات کے ساڑھے دس بجے ہونگے۔ جب کالیچرن کاہور سے واپس آیا۔ اس وقت موسلا دھار بارش اتنے زور سے ہو رہی تھی۔ کہ خیال ہوتا تھا۔ کہ شاید یہ اب بند نہ ہو گی۔

کامنی نے پوچھا۔ "سُنائیے کیا ہُوا؟"

یہ کہہ کر اس نے کپڑے اُتارے۔ کھانا کھایا۔ اور پھر لیٹ کر تمباکو پینے لگے۔ ان کے چہرہ سے غمگینی ٹپکتی تھی۔"

کامنی بہت دیر سے چُپ تھی۔ اُس نے اپنے خاوند سے پُوچھا۔ "کہو کیا سُنا؟"

کالیچرن نے کہا۔ "تم نے ضرور غلطی کی ہے"
کامنی یہ سُنکر اپنے دل میں شرمندہ ہو اُٹھی عورت کبھی بھُول نہیں کرتی۔ اور اگر کرے بھی تو ایک آدمی کو اسے عورت پر ظاہر نہ کرنا چاہیئے۔ اس غلطی کو اپنے سر لینے ہی میں بھلائی ہوتی ہے۔ کامنی نے ذرا گرم ہو کر کہا۔"
"کیسی غلطی ذرا میں بھی تو سنوں"
کالیچرن نے کہا۔" جس عورت کو تم نے گھر میں رکھا ہے۔ وہ تمہاری کلابانی نہیں ہے"
ایسی بات سُنکر غصہ آجانا بالکل معمولی بات ہے۔ اور خاص کر اپنے خاوند کے مُنہ سے سُنکر کس طرح عورت اپنے آپ میں رہ سکتی ہے؟"
بہت خوب! میں اپنی سہیلی کو نہیں پہچانتی۔
تمہارے پہچاننے سے تو پہچانوں گی"
میں یہ نہیں کہتا۔ کہ تم اپنی سہیلی کو نہیں پہچانتی مگر میں یقین سے کہتا ہوں۔ کہ تمہاری سہیلی مر چکی ہے۔ اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے
کامنی نے ہنس کر کہا۔" ذرا ان کی باتیں تو سنو تم ضرور کوئی غلطی کر آئے ہو۔ تم کسی اور کے ہی

گھر چلے گئے ہو۔ تم سے وہاں جانے کو کس نے کہا تھا۔ ایک خط لکھ کر بھیج دینے سے ہی سب معاملہ صاف ہو جاتا۔"

اپنی عورت کی اس طعنہ زنی سے اُداس ہو کر کالی چرن اس بات کا ثبوت دینے لگے۔ مگر اس بات کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ دونوں طرف "ہاں نہ" ہوتے آدھی رات سے زیادہ گذر گئی۔ مگر دل سے دونوں ہی کلیانی کو گھر سے نکال دینے کے لئے تیار تھے۔ کیونکہ کالیچرن کا خیال تھا کہ وہ عورت کلیانی بن کر اس گھر میں رہ رہی ہے۔ اور اس نے کامنی کو دھوکا دیا ہے اور کامنی کا خیال تھا۔ کہ کلیانی گھر سے ناراض ہو کر بھاگ نکلی ہے۔ اتنا ہوتے ہوئے بھی کوئی اپنی ہار نہ مانتا تھا۔ کالیچرن کہتا وہ کلیانی ہے۔ اور کامنی کہتی کہ کلیانی یہی ہے۔

اسی طرح بحث کرتے کرتے دونوں کی آواز تیز ہو گئی۔ انہیں اس بات کا خیال نہ رہا۔ کہ بغل کی کوٹھڑی میں کلیانی رہائیش ہے۔

کالیچرن نے کہا "بڑی مشکل کی بات ہے

میں سن آیا ہوں کہ کلیانی مر چکی ہے۔"

"میں کیسے یقین کروں؟ جب کہ وہ میرے سامنے موجود ہے۔"

"اچھا تو کلیانی کب مری تھی؟"

اس نے سوچا کہ کلیانی کے مرنے کی تاریخ اس کی چھٹی کی تاریخ سے ملا کر اپنے خاوند کو نیچا دکھلا دے گی۔

مگر جب کالی چرن نے کلیانی کے مرنے کی تاریخ بتلائی۔ تو حساب کرنے سے معلوم ہوا۔ کہ جس دن کلیانی ان کے گھر آئی تھی، ٹھیک اس کے ایک دن پہلے کلیانی کے مرنے کی تاریخ تھی۔ یہ دیکھتے ہی کامنی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ کالی چرن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

عین اسی وقت کامنی کے کمرہ کا دروازہ کھلا ہوا سے چراغ گل ہو گیا۔ کمرہ میں اندھیرا چھا گیا۔ اس وقت کوئی تین پہر کے قریب رات گذر رہی ہو گی۔ باہر پانی برس رہا تھا۔

کلیانی نے کہا "بہن! میں تمہاری سہیلی کلیانی ہی ہوں۔ لیکن اب میں زندہ نہیں مر چکی ہوں"

کامنی کی چیخ نکل گئی۔ کالی چرن کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔

کلیانی پھر کہنے لگی۔ "مرلے کے علاوہ میں نے تمہارا کیا قصور کیا ہے۔ میرے لئے اگر دونو جہانوں میں جگہ نہیں ہے۔ تو بتاؤ میں کہاں جاؤں؟"

اور پھر چلا کر بولی۔ "کہاں جاؤں؟"

یہ کہتے ہی وہ گھر سے باہر نکل گئی۔

---

(۴)

کلیانی کسی نہ کسی طرح اپنے سسرال کے پاس پہنچی اس وقت اس کی جیٹھانی اپنی ایک سہیلی کے ساتھ تاش کھیل رہی تھی۔ نوکرانی باورچی خانہ میں تھی۔ بیمار بچہ بخار اتر جانے پر سویا پڑا تھا۔ کلیانی نظر بچا کر بچہ کے پاس پہنچی۔ معلوم نہیں وہ کیا سوچ کر سسرال آئی تھی۔ وہ خود بھی اس بات کو نہ جانتی تھی۔ شاید آخری مرتبہ اپنے ہاتھوں سے پرورش پائے ہوئے بچے کو دیکھنے کے لئے ہی آ گئی ہو۔

چراغ کی روشنی میں اس نے دیکھا۔ کہ بیمار بچہ پڑا سو رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کی بیمار آنکھیں محبت سے اُمڈ پڑیں۔ اُسے اُٹھا کر وہ محبت کئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ سوچتی تھی۔ کہ میں نہیں ہوں اس بچے کو دیکھنے والا اس کی خبر خبر لینے والا اور کون ہے اس کی ماں کو اس کا کچھ خیال نہیں ہے۔ میں نے ہی اس کی پرورش کر کے اُسے اِتنا بڑا کیا ہے۔ اب کون اس کی پرورش کرے گا۔ اچانک ہی بچے نے کروٹ بدلی۔ کمزور آواز سے بولا —" چاچی! پانی دو۔ کلیانی اپنے دل میں کہنے لگی۔ میرا بچہ ابھی تک مجھے نہیں بھولا۔ اس نے جلدی سے اُسے پانی پلایا۔

جب تک تو بچہ نیند میں تھا۔ تب تک تو وہ پہلے کی طرح چاچی کے ہاتھ سے پانی پیتا رہا۔ مگر جب کلیانی نے اُسے پھر لٹا دیا۔ تب ان کی نیند کھل گئی۔ وہ چاچی سے لپٹ کر بولا۔

" چاچی! تم مر گئی تھی؟

چاچی نے کہا — ہاں بچہ"

بچے نے بھولے پن سے کہا۔

" اب تو بچہ آ گئی ہے۔ اب تو تم نہیں مروگی؟
اس کا جواب دینے سے پہلے ہی بہت شور وغل مچ گیا۔ نوکرانی بچہ کے لئے ساگودانہ لے کر آئی۔ یکلخت کلیانی کو دیکھ کر ساگو دانہ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اور وہ چیخ مار کر بیہوش ہو کر گر پڑی نوکرانی کی چلاہٹ سُن کر جیٹھانی بھی "ناشتہ" پھینک کر آئی۔ اور یہاں کا نظارہ دیکھ کر دنگ رہ گئی اس کا جسم کانپ اُٹھا۔ وہ چُپ چاپ کھڑی رہی۔ جیسے کوئی مٹی کا بُت بنا ہے۔
یہ سب معاملہ دیکھ کر بچہ بھی ڈر گیا۔ اس نے رو کر کہا۔

چاچی! تم جاؤ۔"

کلیانی نے آج کئی دنوں بعد محسوس کیا۔ کہ وہ مری نہیں ہے۔ وہی پرانا گھر۔ وہی آدمی۔ وہی بچہ اور وہی بچہ کی محبت ہے۔ اس میں اور ان سب چیزوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مگر بچے کے گھر آکر اس نے دیکھا۔ اور سمجھا کہ وہ مری نہیں زندہ ہے۔ اس نے اپنی جیٹھانی سے کہا۔"

" بہن! مجھے دیکھ کر تم کیوں ڈر رہی ہو؟ میں

تو زندہ ہوں"

اب رکمنی گوپال کی عورت بھی کھڑی نہ رہ سکی۔ وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔

اتنے میں رام گوپال اندر آئے۔ کلمبانی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔

" بھئیا! کیا تم کو یہی لازم ہے۔ یہی ایک بچہ ہمارے خاندان میں ہے۔ اس پہ تمہاری نگاہ کیوں ہے۔ تمہارے مرنے کے بعد سے ہی تمہاری یاد میں دن بدن کمزور ہوتا چلا رہا ہے۔ اس کی بیماری نہیں جاتی وہ دن رات چاچی چاچی کرتا رہتا ہے۔ جب تم اس دنیا سے چلی گئی ہو۔ تو تمہارے لئے یہ محبت اچھی نہیں ہے۔ ہم تمہارا شرادھ گیا میں کراویں گے"

یہ سنکر کلمبانی بے صبری ہو گئی۔ اس نے کڑک کر کہا:

" میں مری نہیں ہوں۔ میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں کہ میں مری نہیں ہوں" یہ دیکھ۔ اتنا کہہ کر اس نے لوٹا۔ اٹھا کر سر میں مارا۔ سر پھٹ گیا۔ اور خون بہنے لگا۔

پھر اس نے کہا "دیکھ میں جیتی جاگتی ہوں"

رام گوپال بُت کی طرح کھڑے رہے۔ بچہ ڈر سے دادا۔ دادا۔ پکارنے لگا۔ دونوں بے ہوش عورتیں زمین پر پڑی تھیں۔

ہوش آنے پر کلیانی نے پھر کہا۔ "بس مری نہیں میں مری نہیں"

یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔ اور باہر صحن کے کنوئیں میں کود پڑی۔ رام گوپال نے اندر سے ہی اس کے کودنے کی آواز سُنی!

رات بھر پانی برستا رہا۔ اس کے دُوسرے دن بھی پانی برسنا بند نہ ہوا۔

اس طرح مری ہوئی کلیانی نے پھر مر کر یہ ثابت کر دیا۔ کہ وہ مری نہ تھی۔ رام گوپال کے دل میں ہمیشہ کے لیے شعلۂ الم روشن کر گئی۔

ڈاکٹر سر رابندر ناتھ ٹیگور کے لاجواب افسانے و منظومات

طوفان ہوس پُر سحر معیاری افسانوں کا دلکش مجموعہ ہے۔ بعض افسانے رنگین ہیں بعض پُر درد خون کے آنسو رلانے والے ہیں۔ جو ان کا بہترین ادبی کارنامہ کہلائے جانیکا مستحق ہے۔ قیمت دو روپے

سرد شعلے بہترین، پُر درد نصیحت آموز دلکش، کہانیوں کا گلدستہ ہے۔ انسانی کمزوریوں کا بہترین عکس۔ ان افسانوں کیوجہ سے مصنف کی شہرت مشرق سے مغرب تک پھیلی۔ قیمت دو روپے

منظوم کتب کے تراجم

گیتانجلی یہ وہ لاثانی تصنیف ہے جس پر مصنف کو ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ (یعنی نوبل پرائز) انعام ملا تھا بہترین روحانی۔ اخلاقی، اصلاحی گیتوں کا مجموعہ قیمت عہ

گارڈنر یہ کتاب گیتانجلی کے بعد لکھی گئی ہے۔ جو گیتانجلی کے ہم پایہ ہے۔ اس میں روحانی گیتوں کے علاوہ سوشل گیت بھی ہیں قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ: **بھارت پستک بھنڈار کٹرہ آہلووالیہ امرتسر**

شری ٹیگور کا بےمثال تحفہ

طوفان

دُنیا ادب کے باکمال شاعر ٹیگور کا نام کسی مزید تعارف کا مُحتاج نہیں۔ مندرجہ بالا شاہکار ان کا ماسٹر پیس ہے۔ دلچسپ، سنسنی خیز، عبرتناک، سبق آموز، حیرت انگیز اور پُراثر واقعات کا مُرقع انسانی زندگی کے نشیب و فراز، حُسن و جمال کی پاکیزہ، دلآویز داستان، دُنیا کی سرد مہری عشق اور فرض کا تصادم،

اس کا ہر باب آپ کے دل پر اثر چھوڑیگا۔ نہایت پُر درد اور ہر باب میں ایک نئے راز کا اضافہ، آپ ایک بار شروع کر لیں پھر چھوڑنے کو دل نہ چاہیگا،

قیمت مجلد سے روپے

ملنے کا پتہ

بھارت پُستک بھنڈار کٹڑہ آہلووالیہ امرتسر

(رتنا آرٹ پریس امرتسر میں باہتمام رام ناتھ پرنٹر چھپا۔)